فہرست مضامین

حرف آغاز

مولانا شبلی، امت مسلمہ اور دارالمصنفین	سید جلال الدین عمری	۵

تحقیق و تنقید

شیخ محمد عبدہ کی تجدیدی فکر کے بنیادی خدوخال	حافظ عقیل احمد قریشی	۱۳
حسن البیان فی ما فی سیرۃ النعمان ـ مطالعہ و تجزیہ	ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی	۲۷

بحث و نظر

میڈیکل انشورنس سے متعلق فقہی اکیڈمیوں کے فیصلے اور ان کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محمد امتیاز احمد	۵۱

سیر و سوانح

امام ابوعمرو عبدالرحمن اوزاعیؒ کا علمی مقام اور بین الاقوامی مسائل میں ان کے اجتہادات	مولانا اختر امام عادل قاسمی	۶۷

ترجمہ و تلخیص

مغرب کو اسلام کا تحفہ	ڈاکٹر احمد وون ڈنفر مترجم: ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی	۹۵

تعارف و تبصرہ

ارشاد التسلیم الی علوم حدیث النبی الکریم	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱۰۷
نماز کے اختلافات اور ان کا آسان حل	" "	۱۰۸
امت مسلمہ: مشن اور خود شناسی	" "	۱۱۰
سیرت طیبہ	جناب محمد اسعد فلاحی	۱۱۱
Empowerment of women	ڈاکٹر محمد شہاب الدین	۱۱۳
اقبال اور دبستانِ شبلی	جناب محمد رضوان خان	۱۱۵
ماہ نامہ شمس الاسلام بھیرہ، مولانا امین احسن اصلاحی نمبر	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱۱۶
خبر نامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۵۸)		۱۱۹
مضامین کا انگریزی خلاصہ		۱۲۱ ــ ۱۲۸

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ حافظ عقیل احمد قریشی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامیات، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، خانی وال (پاکستان)

hafizaqeelqureshi@yahoo.com

۲۔ ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

B-104، بدر منزل، پٹیل نگر، v.p نا کہ بھیونڈی (تھانے) مہاراشٹرا

۳۔ ڈاکٹر محمد امتیاز احمد

لیکچرر شعبۂ علوم اسلامیہ، دی یونی ورسٹی آف لاہور (سرگودھا کیمپس) پاکستان

drimtiyaz49@gmail.com

۴۔ مولانا اختر امام عادل قاسمی

مہتمم جامعہ ربانی، منورواشریف، ضلع سمستی پور، بہار

aiadil.akhtar@gmail.com

۵۔ ڈاکٹر احمد وون ڈنفر

نائب صدر انٹرنیشنل کونسل فار اسلامک انفارمیشن (یو، کے)

avd@muslimehelfen.org

۶۔ ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

ziauddin.malikf.alahi@gmail.com

۷۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

mrnadvi@yahoo.com

۸۔ سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

حرف آغاز

مولانا شبلی، امت مسلمہ اور دارالمصنفین

سید جلال الدین عمری

علامہ شبلی نعمانیؒ کی وفات (۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ئ) کو ایک صدی کا عرصہ گزر گیا۔اس مناسبت سے دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کی جانب سے شبلی صدی بین الاقوامی سمینار (۲۹؍نومبر تا یکم دسمبر ۲۰۱۴ئ) منعقد کیا گیا۔اس کا افتتاحی اجلاس،جس کے مہمان خصوصی نائب صدر جمہوریہ ہند جناب محمد حامد انصاری تھے،شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کے گراؤنڈ میں ہوا۔ پہلا اجلاس بعد نماز مغرب دارالمصنفین کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوا۔اس میں متعدد اصحاب علم وفضل نے اظہار خیال کیا اور علّامہ شبلی نعمانی اور دارالمصنفین کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی ۔اس موقع پر مولانا سید جلال الدین عمری،صدر ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ و امیر جماعت اسلامی ہند نے جو اظہارِ خیال فرمایا تھا،وہ ان کی نظر ثانی او حذف و اضافہ کے بعد ہدیۂ قارئین ہے ۔

(رضی الاسلام)

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على رسوله الأمين وعلى آله وأصحابه أجمعين ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين، امابعد!

محترم صدر مجلس،اسٹیج پر تشریف فرما معزز ومحترم حضرات، دوستو، بھائیو اور عزیزو!

میں سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اس تقریب میں شرکت کی سعادت بخشی اور میں دارالمصنفین کے ذمہ دار احباب کا بھی سپاس گزار ہوں،جنہوں نے اس پروگرام میں حاضری اور اظہار خیال کا موقع عنایت فرمایا۔

بزرگو اور دوستو! مولانا شبلی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث اور گفتگو کا سلسلہ جاری ہے۔ ابھی چند ہفتے پہلے ان کے تعلیمی نظریات پر جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ میں سمینار ہوا تھا اور مختلف پہلوؤں سے ان پر اظہار خیال ہوا تھا۔ مولانا شبلی کی شخصیت وسیع الاطراف ہے، اس لیے ان کی خدمات پر کسی ایک مجلس میں روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ ابھی، جیسا کہ بعض حضرات نے کہا، ان کی شخصیت پر بہت سی کتابیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ مولانا کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کا اس وقت میں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

بیسویں صدی کا زمانہ امت کے لیے سکون کا نہیں، بلکہ بڑی سیاسی ہلچل اور اضطراب کا رہا ہے۔ اس کے ساتھ اس میں علمی اور عملی کج روی بھی پائی جاتی تھی۔ اس دور میں امت مسلمہ میں جو چند علمی شخصیات پیدا ہوئیں ان میں ایک نمایاں نام مولانا شبلی نعمانی کا بھی ہے۔ کسی بھی قوم کی علمی وفکری شخصیات اس کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ ان سے قومیں زندگی پاتی ہیں۔ ان کی دکھائی ہوئی روشنی سے راہ نمائی حاصل کرتی اور اپنا راہ عمل طے کرتی ہیں۔ ان سے حرکت وعمل کا جذبہ بھی اسے ملتا ہے۔ مولانا شبلی کی شخصیت اسی طرح کی ہے۔ ماضی قریب میں ان جیسے اصحاب علم کم ہی ہوں گے۔

اسلامیات کا کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جس کی انہوں نے بنیاد نہ رکھی ہو اور بعد کے لوگوں نے اس سے استفادہ نہ کیا ہو۔ ہمارے اسی دیار (لکھنؤ) میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی (۱۸۴۸ـ ۱۸۸۷ئ) نے چالیس (۴۰) سال عمر پائی تھی۔ انہوں نے اتنی کم عمر میں حدیث، فقہ، کلام، رجال وغیرہ مختلف علوم وفنون پر اتنا بڑا علمی ذخیرہ چھوڑا کہ عقل حیران رہتی ہے۔ ان کی تمام تصنیفات عربی زبان میں ہیں اور ہندوستان سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ اب عرب ممالک سے ان کی اشاعت ہورہی ہیں تو ان کے نام کے ساتھ 'الامام' لکھا جارہا ہے۔ مولانا شبلی بھی اسی طرح کے نمایاں فرد تھے۔

مولانا شبلی نابغۂ وقت تھے۔ انہوں نے علم وعمل دونوں میدانوں میں

گراں بہا خدمات انجام دیں۔ مولانا کی کوشش تھی کہ اس ملک میں امت مسلمہ باوقار زندگی گزارے، ذلیل اور پست ہو کر نہ رہے اور احساس کم تری سے نکل آئے۔ جب کسی قوم میں احساس شکست یا احساس کم تری پیدا ہوجاتا ہے تو معاشی اور سیاسی ترقی کی راہیں اس کے لیے مسدود ہونے لگتی ہیں۔ وہ اس صدمہ سے دوچار رہتی ہے کہ جو کچھ تھا، وہ چھن گیا، اب ہم خالی ہاتھ رہ گئے اور دوسرے لوگ ہم سے آگے نکل گئے۔ وہ رہبران قوم، جو اس کی اصلاح کا عمل انجام دیتے ہیں، ان کی کوشش ہوتی ہے کہ قوم کو اس کیفیت سے نکالیں اور سیاسی میدان میں دوسروں سے پیچھے رہ جانے کا جو احساس اس پر طاری ہے اسے دور کرنے کی سعی کریں۔ مولانا شبلی نے اس پہلو سے اہم کردار ادا کیا۔ عام طور پر جو لوگ علمی دنیا میں زندگی گزارتے ہیں، انھیں ملکی اور بین الاقوامی مسائل سے دل چسپی کم ہی ہوتی ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا شبلی کے سینہ میں دل درد مند تھا۔ وہ اپنی تمام تر علمی مصروفیت کے باوجود امت کے دکھ درد سے واقف ہی نہیں تھے، بلکہ اس کے لیے جو کوشش ممکن تھی انھوں نے وہ کوشش بھی کی۔ اس کی نمایاں مثال یہ ہے کہ کان پور فساد میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی شہادت کے بعد امت میں اضطراب اور بے چینی تھی۔ اس موقع پر گورنمنٹ کی طرف سے ہونے والی زیادتی پر جس طرح انہوں نے احتجاج کیا وہ ان کی دینی حمیت اور ملی درد مندی کا ثبوت ہے۔ جنگ بلقان اور طرابلس کے سلسلے میں مولانا کی مشہور نظم 'شہر آشوب' محض شاعری نہیں، بلکہ ان کے اندرونی کرب اور اندوہ کی ترجمان بھی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امت کے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے۔ آج اگر یہ احساس ہمارے اندر پیدا ہوجائے کہ امت مسلمہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں ہو، وہ ایک وحدت ہے اور ہر فردِ مسلم ہمارا دینی بھائی ہے اور اس کے درد کو محسوس کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے، تو امت کے حالات میں تبدیلی آسکتی ہے۔ مولانا شبلی کے اندر امت کے لیے جو فکر مندی اور تڑپ تھی اس کی اور بھی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہی فکر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

دارالمصنفین علامہ شبلی کی یادگار ہے۔ انھوں نے سیرت و تاریخ کے میدان میں جس علمی سفر کا آغاز کیا تھا، دارالمصنفین نے اس میں اپنی پیش قدمی جاری رکھی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ برصغیر کا کوئی ادارہ اس میدان میں اس کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

مسلمانوں کے علمی اور فکری کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ علم کلام بھی ہے۔ اموی دور کے آخر میں یونانی علوم وفنون عربی میں منتقل ہونے شروع ہو گئے تھے، البتہ عباسی دور میں اسے عروج حاصل ہوا۔ ان علوم میں طبیعی اور سائنسی علوم کے ساتھ منطق، فلسفہ اور معقولات بھی شامل تھے۔ ان کے تعلیم وتعلم اور فروغ کے ساتھ اسلامی عقائد پر عقلی اور فلسفیانہ بحثیں شروع ہوگئیں۔ اس کے نتیجہ میں علم کلام وجود میں آیا اور نام ور متکلمین مسلمانوں کی صفوں میں ابھر کر سامنے آئے۔ بہت سے مسائل میں ان کا اندازِ فکر ایک دوسرے سے جدا تھا، اس کے نتیجے میں مختلف فکری اسکول قائم ہو گئے۔ اسی کے ساتھ ان کے درمیان بحث ومباحثہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا شبلی نے اپنی تصنیف 'علم الکلام' میں اس کی تاریخ بیان کی ہے۔ اسی کے ساتھ متکلمین کے دلائل، ان کی قدر و قیمت اور ان کے ضعف وقوت کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اپنی دوسری تصنیف 'الکلام' میں اسلامی عقائد، وجود باری تعالیٰ، اس کی وحدانیت، نبوت و رسالت، معجزات اور قرآن مجید کے کلامِ الٰہی ہونے پر بحث کی ہے اور اس کے دلائل فراہم کیے ہیں۔ انہوں نے 'الغزالی' اور سوانح مولانا روم میں بھی ان مسائل سے تعرض کیا ہے۔

مسلمان متکلمین کے مباحث کا تعلق اسلام کے منکرین اور مخالفین سے زیادہ ان فرقوں سے ہے جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ ان میں سے ہر فرقہ اپنی تائید میں دلائل پیش کرتا ہے اور فریق مخالف اس کی تردید کرتا ہے۔ موجودہ دور میں اس موضوع سے متعلق سوالات کی نوعیت بڑی حد تک تبدیل ہوگئی ہے۔ اس لیے ان مباحث سے کسی حد تک فائدہ تو اٹھایا جاسکتا ہے، لیکن ان پر انحصار نہیں کیا جاسکتا، اس

کے لیے نئے علم کلام کی ضرورت ہے۔

الحاد یا انکار خدا دورِ حاضر کی فکری بنیاد ہے۔ اسی پر اس کا اجتماعی نظام قائم ہے، حالاں کہ اس وسیع و عریض کائنات کا وجود اس کے خالق کی قوی ترین دلیل ہے۔ اس سے انکار کے بعد وجود کائنات کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ اسی خالق کائنات کو ہم اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

موجودہ دور خالق کائنات کا انکار نہ بھی کرے تو اس کے نزدیک تخلیقِ کائنات کے بعد اس سے اس کا رشتہ منقطع ہوگیا۔ اب یہ کائنات خود بہ خود گردش کررہی ہے، اس میں اس کے خالق کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ انسان بھی اس کائنات کا حصہ ہے اور وہ اپنے فکر و عمل میں آزاد ہے۔ لیکن اس دعویٰ کی کم زوری یہ ہے کہ یہ کائنات اپنے مسلسل عمل سے اس کی تردید کررہی ہے۔ یہ متعین قوانین کی پابند ہے اور انتہائی منظم طریقہ سے سرگرم عمل ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کائنات پوری طرح اپنے خالق کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہ اسے اپنی مرضی سے چلا رہا ہے۔ انسان بھی اپنے وجود و بقا میں اس کے قوانین کا پابند ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ جن معاملات میں اسے اختیار حاصل ہے ان میں بھی وہ اس کی ہدایات کا پابندر ہے۔ اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ ہدایات اسے اللہ تعالی کے رسولوں کے ذریعہ ملتی ہیں۔ وہی اسے اللہ تعالی کی عطا کردہ آزادی کا صحیح استعمال بتاتے ہیں۔

رسول کے معنی پیغام رساں کے ہیں۔ اللہ تعالی کا رسول اس کے احکام و ہدایات بندوں تک پہنچاتا ہے، اس لیے اسے رسول کہا جاتا ہے۔ انسان اللہ کا بندہ ہے، اسے بے چوں و چرا اللہ کے احکام کی اتباع کرنی چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالی کے احکام انتہائی حکمت پر مبنی ہیں اور ان کی عقلی توجیہ کی جاسکتی ہے، لیکن عمل کے لیے ان کی حکمت کا جاننا ضروری نہیں ہے، ان کا من جانب اللہ ہونا کافی ہے۔ اس سے بہت سی کلامی بحثیں ختم ہوجاتی ہیں۔ لیکن دور حاضر کے لیے وحی و رسالت کا تصور ہی ناقابل قبول ہے۔

موجودہ دور سائنس کا دور ہے۔ اس میں ہر مسئلہ کو سائنس کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے۔ مابعد الطبیعیات کے مسائل پر بھی عقلی دلائل سے زیادہ سائنسی ثبوت طلب کیا جاتا ہے۔ اگر کائنات کا مطالعہ اور مشاہدہ کسی مسئلہ کی تائید کرتا ہے تو وہ قابل غور سمجھا جاتا ہے، ورنہ اسے قبول نہیں کیا جاتا۔ اس طرح اب بنائے استدلال عقل اور منطق سے زیادہ سائنسی تجربات اور مشاہدات ہیں۔ قدیم علم کلام میں اس کی جگہ بہت کم ہے۔

موجودہ دور میں دوسری تبدیلی یہ آئی ہے کہ اب اسلامی شریعت جو ہمارے نزدیک اللہ تعالی کا نازل کردہ قانونِ حیات ہے اور جو ہر غلطی اور خامی سے پاک ہے، اس کی تہذیب، معیشت، اس کے بین الاقوامی قوانین، اس کا تصور مساوات، ہر چیز اعتراضات کی زد میں ہے اور اس کی حقانیت کو چیلنج کیا جارہا ہے۔

موجودہ دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ عملی مسائل پر ان کی افادیت کے پہلو سے غور کرتا ہے۔ اگر وہ سماجی افادیت کے حامل نہیں ہیں تو اپنی کشش کھو دیتے ہیں۔ اسلام کے بہت سے احکام، جن کے افادی پہلو پر آج سے پہلے کم ہی بحث ہوتی تھی، اب ہورہی ہے۔ اسلام نے مرد اور عورت سے متعلق جو احکام دیے ہیں، کیا وہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہیں؟ اسلام کے نظام خاندان میں مرد کو قوّام کی حیثیت حاصل ہے؟ کیا یہ صنفی تفریق اور عدمِ مساوات نہیں ہے؟ تعدد ازواج کا کیا جواز ہے؟ اسلام عورت اور مرد کے اختلاط کو غلط قرار دیتا ہے۔ کیا اس سے ان کی سماجی حیثیت متاثر نہیں ہوتی؟ کیا اس کے بغیر دونوں کی مساوی ترقی ہوسکتی ہے؟ اسی طرح موجودہ دور میں سیاسی نظام کی آخری دریافت جمہوریت ہے۔ اس کے مسلمہ اقدار ہیں۔ جمہوریت کے بالمقابل اسلامی ریاست کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان اقدار کی روشنی میں سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ اس میں انسانی حقوق کا کس حد تک احترام ہوگا؟ کیا اس میں سب ہی شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے یا مذہب کی بنیاد پر ان میں فرق کیا جائے گا؟ کیا اس میں آزادی فکر وعمل حاصل ہوگی یا اس پر پابندی عائد ہوگی؟ مختلف مذہبی اور سماجی گروہوں کے ساتھ تعلق کی نوعیت کیا ہوگی؟